۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر آل احمد سرور | شمارہ ۱۲-۲۳

اس شمارے میں

پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر عبد القادر سروری

پروفیسر عبد القادر سروری ۱۰ مارچ کو حیدرآباد سے سری نگر واپس پہنچے۔ ۱۰ مارچ کو ان کے دل میں تکلیف ہوئی اور ۱۱ مارچ کو شب میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ الکشن کے انتخاب کے نتائج کی مصروفیات میں سری نگر ریڈیو کے سوا کسی اخبار یا آل انڈیا ریڈیو کو توفیق نہ ہوئی کہ اس سانحے کا اعلان کرتا۔ سروری صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی۔ وہ جب ملتے اتنے چاق چوبند نظر آتے کہ ۶۵، ۶۶ سال کی عمر کے باوجود وہ پچپن چھپن سال سے زیادہ کے نہ معلوم ہوتے تھے۔ خوب کام کرتے تھے۔ خوب سفر کرتے تھے۔ ہوائی جہاز سے لے کر بس تک جیسا موقع ہوتا۔ اگر جگہ محفوظ نہ ہوئی تو رات بیٹھ کر گزار دی۔ بڑے خوش اخلاق، ملنسار، دوستوں اور ساتھیوں سے معاملات میں وضعدار، طلبہ کے ساتھ شفیق، ایک بلند پایہ محقق، دکنیات اور لسانیات کے ماہر، اردو کے تمام اساتذہ میں بزرگ اور محترم یونی ورسٹی کے اردو کے استادوں کی انجمن کے پہلے صدر تھے۔ عمر کا بڑا حصہ جامعہ عثمانیہ میں گزارا۔ پھر اردو فارسی کے شعبے کے صدر ہو کر میسور چلے گئے۔ کئی سال وہاں گزار کر، پھر صدر شعبہ ہو کر جامعہ عثمانیہ میں آگئے۔ یہاں سے سبکدوش ہوئے تو جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے اردو کے شعبے کے صدر مقرر ہوئے، یہاں آٹھ سال کے قریب کام کر کے امسال سبکدوش ہونے والے تھے کہ بار حیات سے ہی سبکدوش ہو گئے۔

سروری صاحب سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ میں بمبئی سے ستمبر میں ایک ہفتے کے لئے حیدرآباد گیا تھا اور مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں قیام پذیر تھا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب مجھے شعبۂ اردو لے گئے جہاں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور عبد القادر سروری سے ملاقات ہوئی۔ زور صاحب وجیہہ آدمی نکلے، سوٹ بوٹ میں ملبوس۔ خاصے تیز طرار۔ مجھے انھوں نے فوراً حیدرآباد کی اہم چیزیں دیکھنے کی دعوت دی۔ اپنی کچھ کتابیں بھی نذر کیں۔ سروری صاحب ان کے مقابلے میں کچھ ماند نظر آئے۔ سنجیدہ اور نسبتاً کم گو، مگر یہ احساس ضرور ہوا کہ اپنے مضمون پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بعد میں مولوی عبدالحق صاحب سے ان دونوں کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا۔ مولوی صاحب زور صاحب کے مقابلے میں سروری صاحب کے علم کو زیادہ گہرا سمجھتے تھے۔ وہ زور صاحب کی جلد بازی اور اشتہاریت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب ویسے بھی ان حیدرآبادیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو ہر معاملے میں ملکی اور غیر ملکی کا سوال اٹھا دیتے تھے۔

سروری صاحب سے اس کے بعد برابر ملاقات ہوتی رہی

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی کاپی ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ ۱۰ روپے

ان کی تصانیف بھی نظر سے گزرتی رہیں۔ وہ جہاں رہے اپنے ساتھیوں اور طلبہ کی بڑی مدد کرتے رہے۔ ہر اہم ادبی اجتماع میں وہ ضرور شریک ہوتے تھے۔ اردو کے استادوں کی انجمن کا خیال سب سے پہلے سروری صاحب کو آیا۔ لکھنؤ میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ پنڈت کیفی اردو کے شعبے کے صدر تھے۔ اس میں مقالات پڑھنے کے لئے سروری صاحب، نجیب اشرف صاحب، خواجہ احمد فاروقی صاحب آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے اس کا ابتدائی خاکہ بنایا۔ اسی وقت سے خیال تھا کہ سروری صاحب کو اس کا صدر بنایا جائے گا۔ سروری صاحب کے یہاں حیدرآباد اور سری نگر میں متعدد بار قیام کا اتفاق ہوا۔ وہ مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے تھے۔ میں نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی کہ سروری صاحب یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کے ممتاز استادوں سے گہرے مراسم رکھتے تھے اور ان سے خاص طور پر ملواتے تھے۔ زور صاحب اور سروری صاحب پہلے بڑے دوست تھے۔ بعد میں اختلاف ہوگیا۔ ایک دفعہ زور صاحب نے شکایت کی کہ آپ کی سروری صاحب کی دوستی کیوں ہے۔ سروری صاحب نے کبھی شکایت نہ کی کہ میں دونوں کے اختلاف کو نظرانداز کرکے دونوں سے اپنے مراسم رکھنا چاہتا تھا۔

سروری صاحب نے دکنیات، لسانیات اور اردو تحقیق میں نمایاں کام کیا ہے یہ موقع ان کے اور زور صاحب کے کام کے موازنے کا نہیں ہے۔ دونوں کا کام ہمارے لئے قابل قدر ہے۔ کلیات سراج، سیف الملوک و بدیع الجمال، زبان اور علم زبان، اردو مثنوی کا ارتقاء، جدید اردو شاعری، دنیائے افسانہ، کشمیری ادب کی تاریخ سروری صاحب کی وہ کتابیں ہیں جن سے برابر استفادہ ہوتا رہے گا۔ ان کی نظر وسیع تھی۔ وہ ساری عمر طالب علم رہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا بیان ہے کہ وہ لسانیات کے موسم گرما کے اس کورس میں ایک طالب علم کی طرح شریک ہوتے تھے جس میں مسعود صاحب بھی درس دے رہے تھے۔ کشمیر میں جب اردو کے اساتذہ کی کانفرنس ہوئی تو وہاں کچھ مقامی حضرات نے اس کانفرنس کو کشمیری زبان کے لئے خطرہ سمجھا، پھر بھی کانفرنس کامیاب رہی۔ اس کی کامیابی زیادہ تر سروری صاحب کی ان تھک محنت اور دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھی۔ کانفرنس کے بعد میرے ساتھ گلمرگ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بالکل تازہ دم ہیں۔ کشمیر میں ان کا تقرر شروع میں تین سال کے لئے ہوا تھا۔ ان کی بڑھاپے کے باوجود کام کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے انھیں پہلے تین سال کے لئے اور پھر مزید دو سال کے لئے توسیع دی گئی وہ آخر تک جوانوں کی طرح کام کرتے رہے، ہندوستان کے کونے کونے میں سفر کرتے رہے۔ اب یہ بے تاب روح، یہ بے چین فطرت، یہ علم کی پختگی اور نظر کی وسعت ہم سے چھن گئی۔ اس نقصان کی تلافی کیسے ہوگی اور کون کرے گا، کوئی بتا سکتا ہے؟

جموں یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر عبدالقادر سروری کو خراج عقیدت اور تعزیتی قرارداد

جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر، رجسٹرار اور شعبۂ اردو کے اساتذہ و طلبہ کا یہ جلسہ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے انتقال پر اظہار رنج و ملال کرتا ہے۔ مرحوم سروری صاحب اردو کے سب سے بزرگ استاد تھے۔ وہ ایک جید محقق، ماہر لسانیات نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ کشمیر یونیورسٹی میں آنے سے قبل وہ میسور یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ اپنے بے پایاں علم اور عاف کے علاوہ وہ ایک شریف اور مخلص انسان تھے۔ جموں کے شعبۂ اردو پر ان کی دہی چشم لطف تھی جو کشمیر کے شعبہ پر۔ شعبے کا یہ اجلاس دعا کرتا ہے کہ خدا مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے اور واحقین کو صبر عطا فرمائے۔

• گیان چند

بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام

اردو حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ ۱۲ر فروری ۱۹۹۱ء سے اردو کا الگ شعبہ قائم کردیا گیا ہے۔ فارسی و عربی کا شعبہ الگ ہوگیا ہے۔

○ رام ناتھ

تذکیر و تانیث شائع ہوگیا

بنگال کے جواں سال شاعر جناب عبدالغفار مخترؔ کی کتاب "تذکیر و تانیث" شائع ہوگئی ہے موصوف کی یہ کتاب مفید اور معلوماتی ہے۔ ضروری تفصیلات کے لئے اس پتہ پر رجوع کریں۔

جناب عبدالغفار مخترؔ معرفت وِدیا ساگر پبلیکیشنز، ۲۰۰ مہاتما گاندھی روڈ، کلکتہ ۷

• اے ایف ۔ پرویز کلکتہ

چراغ راہ شائع ہوگیا

سلک و جیز کے موضوع پر ایک کتاب چراغ راہ شائع ہوگئی جس کو جناب ایم اے مظفر نے ترتیب دیا ہے۔ ملنے کا پتہ

جناب یوسف عبداللہ انصاری ایم کام جنرل سکریٹری انجمن اصلاح المسلمین (مظفر پور)، ۵ ولی اللہ لین کلکتہ ۷

• اے ایف پرویز

انیس امام

مردم شماری سنہ ۱۹۷۱ء

اس کی اہمیت اور اردو دوستوں کے فرائض

اردو اخبارات مردم شماری کی اہمیت کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ شاہ آباد ضلع مردم شماری کمیٹی ان کی طرف اشارے بھی کر چکی ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں کہ اس پر تفصیل سے لکھا جائے۔ آزاد ہندوستان میں یہ تیسرا موقع ہے۔ ہندوستان کے تمام اردو اخبارات اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ اب شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ ہماری حکومت کے بہت سارے منصوبوں کا انحصار مردم شماری کے نتائج پر پڑتا ہے۔ اردو آبادی کے لئے بھی تعلیمی، لسانی اور سیاسی منصوبے کی بنیاد ان کی تعداد پر ہی رکھی جائے گی۔ تعداد کے غلط اندراج کے باعث ہندوستان کی اردو آبادی بہت کم نظر آتی ہے۔ ریاست بہار کو ہی مثال کے لئے لیجئے۔ پوری ریاست میں صرف ۳۱ لاکھ اردو بولنے والے ۱۹۶۱ء میں دکھائے گئے۔ جبکہ یہ تعداد اس سے کئی لاکھ زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ اس سے ہمیں بہت سارے نقصانات ہوئے۔ اگر اردو کے مخالفین کی صرف یہی ایک بات صحیح فرض کر لی جائے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جب بھی پورے ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی آبادی تقریباً دس کروڑ ہونی چاہئے تھی۔ لیکن اردو والوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ایک طرف تو اردو کے مخالفین اپنی مادری زبان بھوجپوری، میتھلی اور مگہی وغیرہ کی بجائے ہندی لکھاتے ہیں اور دوسری طرف اردو والوں کو گمراہ کر کے ان کی مادری زبان بھوجپوری، ہندی یا ہندوستانی لکھوا دیتے ہیں۔ اس سازش میں شمار کاروں کی اکثریت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اردو کے علاقے وہی ہیں جو ہندی کے ہیں لیکن ہندی والوں کی مادری زبان کچھ اور ہی ہے۔ ریاست بہار ہی کو لیجئے۔ شاہ آباد اور سارن مکمل اور موتیہاری و چمپارن کا ایک بڑا حصہ بھوجپوری کا علاقہ ہے۔ دربھنگہ مکمل اور مونگیر کا آدھی حصہ بیتا اور موتیہاری کا پوربی حصہ اور پورنیہ کا مغربی علاقہ میتھلی کا علاقہ ہے۔ سنتھال پرگنہ اور پورے چھوٹا ناگپور ڈویژن میں نمایاں اکثریت سنتھالی، منڈا اور اوراؤں کی ہے۔ ہندی کی آبادی اس اعتبار سے اردو کے مقابلے میں کم ہے اس لئے کہ اردو پوری ریاست کے گوشے گوشے میں بولی جاتی ہے۔ اردو کی اسی بہتر پوزیشن کے پیش نظر مخالفین اردو نے طرح طرح کی لسانی تحقیقات کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔ اردو، ہندی کی ایک شیلی (طرز) ہے۔ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اردو کا رسم الخط بدیسی ہے۔ اردو بدیسی زبان ہے وغیرہ وغیرہ ان ساری غلط بیانیوں کی حقیقت سامنے آ چکی ہے۔ رسم الخط کے دیسی اور بدیسی ہونے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ دیوناگری ہندوستان میں پہلے داخل ہوئی فارسی رسم الخط بعد میں۔ اور ہندی میں الفاظ و قواعد کی ۸۰ فیصد مماثلت کے باوجود دونوں دو زبانیں ہیں لیکن اردو کی پوزیشن کئی اعتبار سے ہندی سے بہتر ہے۔ ہندی سرکاری زبان ہے اردو عوام کی زبان ہے۔ دیوناگری رسم الخط کا حلقہ محدود ہے اردو رسم الخط دنیا کے ایک بڑے حصے میں معروف و مقبول ہے۔ دکنی ہندوستان میں ہندی کی سخت مخالفت کی جا رہی ہے اردو کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ مشترکہ تہذیب کی نشانی اور محبت و اخوت کی علمبردار ہے۔ اردو نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہندی پیچھے رہ گئی۔ اردو کی یہ خصوصیت ہے کہ کسی زبان سے نفرت نہیں کرتی اور نہ کسی خاص مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس میں رام، کرشن، عیسیٰ، موسیٰ، نانک، کبیر، بدھا، خدا اور رسول سب کا تذکرہ پایا جاتا ہے اور بڑے خلوص و احترام کے ساتھ پایا جاتا

ایم کوٹھیاوی راہی

غزل

ساعتِ غم کا یہ منظر بھی گذر جانے دو
میں اب اک راکھ کا پیکر ہوں بکھر جانے دو

درد کے غار میں جس شخص نے آنکھیں کھولیں
وہ اگر دل میں اترتا ہے اتر جانے دو

کیا کرو گے اسے کمرے میں مقفل کر کے
آج تنہائی کو سڑکوں پہ بکھر جانے دو

چاند کا گیت کہ سورج کا سلگتا نوحہ
کوئی آواز سہی لب پہ ٹھہر جانے دو

لوگ جیسے بھی ہوں، اچھے ہیں یا برے ہیں ہم
کوئی الزام بھی اب ان کے نہ سر جانے دو

کیوں نہ ہر حال میں ہر رنگ میں زندہ ہی رہیں
یار اگر ضد پہ اڑ آئے تو مر جانے دو

مشورہ تلخ سہی پھر بھی گوارا ہے مجھے
تم اب خود کو کسی اور کے گھر جانے دو

فلسفی ہوں نہ مفکر ہوں نہ شاعر راہی
خود سے بیزار ہوں اے اہل نظر جانے دو

ہے۔ ہندی پر میں کوئی الزام عائد نہیں کرتا لیکن ہمارے بچوں کے لئے نصاب کی جو کتابیں ہندی میں پائی جاتی ہیں ان کا ایک سرسری مطالعہ ہی اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہوگا کہ وہاں کیا ہے۔

متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں اردو والوں کو یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ اردو کی مخالفت کیوں کی جارہی ہے اردو دوست اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی یہی خوبیاں اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں تو یہ ان کی نادانی ہے۔ زبان اس کے بولنے والوں کی وجہ سے ہے۔ اس کے تحفظ و ترقی کی ذمہ داری اس کے بولنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کا مسئلہ ایک زبان ہی کا مسئلہ ہوتا تو کوئی زبان کبھی نہیں مرتی۔ اس کے بولنے والوں کے اور بھی بہت سارے مسائل ہیں۔ اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان کے دوسرے مسائل اردو والوں کو اپنی زبان سے بے نیاز و غافل نہ کردیں اس لئے اس طرف بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے اور سچ پوچھئے تو زبان کا مسئلہ دوسرے تمام مسائل پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے لئے چھوٹی موٹی مثالیں کافی ہوں گی۔ فرض کیجئے آپ نے اپنی زبان سے بے توجہی برتی۔ آپ کی تعداد مختصر ہوجائے گی آپ ہر جگہ اجنبی سے نظر آئیں گے۔

تجارتی منڈی میں آپ نقصان اٹھائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ دکنی ہندوستان میں تامل، تیلگو، ملیالم جاننے والے واجب داموں پر چیزیں خرید لیتے ہیں لیکن اتری ہندوستان کے لوگ وہاں اجنبی سمجھے جاتے ہیں اور انھیں زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

سماج میں آپ اقلیت میں ہوں گے۔ آپ کی تہذیب و شائستگی کا مذاق اڑایا جائے گا۔ آپ کہاں جائیں گے۔ سیاست میں مذہب اور ذات پات کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے مقابلے میں آپ کی کیا حیثیت ہوگی۔ آپ معتد بہ تعداد میں ہوں گے تو آپ کا احترام کیا جائے گا ورنہ آپ استعمال کئے جاتے رہیں گے۔ زبان کے نام پر ہی آپ متحد ہو سکتے ہیں اور تمام برائیوں کی کاٹ پیش کرسکتے ہیں۔

مخالفین اردو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ کل جب صحیح جمہوری نظام قائم ہوگا تو وہ اردو زبان ہی ہوگی جو دنیا کے بڑے حصے سے ہندوستان کے بہتر تعلقات کی استواری میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اپنی رسم خط کی وجہ سے بھی اور اپنی عالمگیر مقبولیت کے باعث بھی۔

ان حقائق کے پیش نظر اردو دوستوں سے میری اپیل ہے کہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے موقع پر مردم شماری سلپ کے خانہ نمبر ۱۰ میں اپنی مادری زبان اردو اور صرف اردو درج کرائیں خانہ نمبر ۱۱ جو ثانوی زبان کے لئے ہے اس میں فارسی، عربی، انگریزی، بھوجپوری، بنگلہ، تامل، تیلگو، جس سے آپ واقف ہوں، کچھ بھی درج کرا سکتے ہیں۔ مادری زبان صرف ایک ہوگی ثانوی زبان ایک سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۶ سے آگے

وہ بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ ہم برابر خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنے ادبی قافلے کو ارتقاء کی طرف لے جارہے ہیں اور سرخرو ہیں، نہ نادم، نہ احساس کمتری کا شکار۔ لیکن نثار صاحب کا مشاہدہ ہے کہ۔ "ہمارا ادب بہت سے پہلو رکھتا ہی نہیں"۔ اگر بہت سے پہلو سے ان کی مراد ٹھوس علمی معلوماتی اور سائنسی خیالات اور نظریات کی اشاعت سے ہے، تو بات ٹھیک ہے۔ اس سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ وہ ادب کو درمیان میں نہ لائیں۔ دانشوری کی تشریح و توضیح، سماجی علوم، نظریات، فلسفہ، تاریخ، مذہب، سائنس اور اسی قبیل کے غیر ادبی خیالات کی ترویج جو صاحب قلم اور اہل بصیرت اردو میں کرنا چاہتے ہیں کریں۔ اور اپنا نام دانشوروں کی فہرست میں لکھائیں۔ یہ ایک ملکی خدمت ہوگی۔ لیکن اس کا اردو ادب کے مزاج، تقاضوں اور ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

ذکاء الدین شایاں

دانش وری

"اردو میں دانش وری کی روایت" پر دہلی میں جو سیمینار منعقد کیا گیا اور اس سلسلے میں جو مضامین اور مباحث سامنے آئے، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دانش وری کا موضوع نہ صرف یہ کہ مبہم ہے بلکہ کسی حد تک مضحک بھی۔ اگر ہم لفظ "دانش" کو صرف لغوی معنی میں استعمال کریں تو یہ تخیل، وجدان، شعری فکر، تخلیقی قوت، خلاقانہ ذہن اور بہ حیثیت مجموعی ادب (CREATIVE LITERATURE) کی نفی کرتے ہوئے مجرد عقل، فہم، فراست اور درک ہی کا قائم مقام بن سکتا ہے۔ لیکن اگر "دانش وری" کو ہم نے INTELLECTUALISM کے معنی میں لیا ہے، تو اس میں عقل و فہم کے ساتھ برائے نام فکر و تخیل کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ ان تعریفوں کی روشنی میں متذکرہ بالا موضوع کا تجزیہ کرنے پر عجیب تضادات ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً "مسلم دانش وری" اور "سیاسی دانش وری" جیسی اصطلاحیں، "اردو میں دانش وری" کے موضوع پر سوچنے میں سوائے ذہنی انتشار کے اور کچھ نہیں دیتیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ انھیں کے متوازی ہمیں "ادبی دانشوری" کی اصطلاح بھی بنانا ضروری ہے۔ شمس الرحمٰن صاحب فاروقی بھی "دانشوری" کا مفہوم واضح کرنے سے قاصر ہیں (ہماری زبان یکم مارچ ۱۹۸۱ء) اور صرف آمنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

— اس بزم کے برپا کرنے والوں نے غالباً اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ ہم اپنے مسائل سے باخبر ہوں، ان پر سوچتے ہوں اور ان کا حل تلاش کرنے کے درپے رہتے ہوں تو دانش ور کہلائیں گے۔

ہمارے ذہن شاداب ہوں، ان میں نئے افکار اُگتے ہوں، مستقبل کے خاکے بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ماضی سے باخبر ہوں یا عبرت حاصل کرتے ہوں، حال پر قانع اور فردا سے مایوس نہ ہوں وغیرہ اس کے علاوہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

اس اقتباس کی رو سے دانش ور وہ ہوگا جو نئے علوم کی مدد سے زندگی کے مسائل پر غور و خوض کرے گا، اور ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کی پیش گوئی کے ذریعہ حل تلاش کرے گا۔ یعنی اس ضمن میں سماجیات، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ اور دیگر علوم کا مطالعہ ٹھوس عقل و دلائل سے کیا جا نا گزیر سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں "دانش وری" کے دائرہ سے تخلیقی ادب بالکل باہر ہو گیا، کیونکہ شاعر و ادیب کی دانشوری ضمنی ہوتی ہے۔ ہم فنکار سے دانش و فہم کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ وجدان، تخیل اور شعری فکر میں اگر "دانشوری" کہیں پسِ پشت کر آ بھی جاتی ہے تو وہ ادب و فن سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتی۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس موضوع میں ادب و شعر کو بھی شامل کیا گیا ہے اور اس پر اس طرح بحث ہوئی ہے کہ اردو ادب میں اگر دانش وری کی روایت نہیں ہے تو جیسے وہ بدقسمت زبان ہے۔ ہماری زبان مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۱ء میں شمس الرحمٰن صاحب فاروقی نے اپنے مضمون میں تخلیقی ادب کو "دانشوری" سے ہم آہنگ کر کے بڑے عجیب نتائج اخذ کئے ہیں۔ وہ جب اردو ادب کا ذکر کرتے ہیں تو سرسید، حالی، اقبال اور غالب کے علاوہ کوئی ادیب و شاعر دانش ور نہیں دکھتا۔ یہاں اس امر کی جانب توجہ ضروری ہے کہ شعر و ادب پر جب گفتگو کی جائے تو صحافت، اصلاح قومی خدمات، ملی ترقیات اور علمی نظریات کو الگ رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی مصلح، واعظ، قومی خادم اور عالم ادب و شعر کو اپنے نظریات اور اعمال کا آلۂ کار بناتا ہے تو اسے ہم شاعر یا ادیب کا درجہ نہیں دے سکتے اور محض ان نظریات کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت

زبیر شفائی

غزل

یہ آسمان، جہاں تک دکھائی دیتا ہے
مری نظر کو فریب، انتہائی دیتا ہے

عجیب شہر ہے مجھ کو چڑھا کے سولی پر
لہولہان بدن کی دہائی دیتا ہے

کوئی نہیں ہے، مگر ساری ساری رات کوئی
مجھے معاوضۂ لب کشائی دیتا ہے

نظر نظر میں ہے آمیزش ہوس یعنی
جو سوچتا ہے بہ مشکل سجھائی دیتا ہے

زبیر ثقل سماعت کے باوجود مجھے
لہو میں شور برابر سنائی دیتا ہے

بہ حیثیت فن کار بڑھائی نہیں جا سکتی۔ حالی اور سرسید بنیادی طور پر مصلح تھے۔ ان کی شاعری اور ان کا ادب ان کے مقاصد کا ایک ذریعہ تھا۔ اس لئے وہ فنکار نہیں تھے۔ غالب اور اقبال مکمل شاعر تھے۔ ان کی فکر و دانش ضمنی تھی، جس پر روح و وجدان اور تخیل کی کارفرمائی نمایاں رہی۔ اس سلسلے میں مولانا حسرت موہانی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کیا انھیں دانش ور نہیں کہا جا سکتا؟ لیکن جب وہ شاعر بن کر ہم سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کی دانش وری کہاں رہ جاتی ہے؟ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:۔

"ادب اردو سے اگر ہم غالب، سرسید، اقبال اور حالی کو بے دخل کر دیں تو ایسا کون لکھنے والا ہے جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہو کہ زمانے میں محبت کے سوا بھی کوئی غم ہے؟"

یہاں مصنف کی فکر کا وہی انداز ہے جو صحافت، علم، فلسفہ اور نظریات کو شعر و ادب سے گڈمڈ کرنے کا عادی ہے اور ادب کو ان سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ سرسید اور حالی کی اصلاحی تحریکات اور ترقی پسند فنکاروں کے نظریات اور پروپگنڈے کو ہی نثار صاحب "محبت کے سوا کوئی غم" سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں وہی شاعر اور ادیب دانشور ہیں جنھوں نے ادب کی شکل میں علمی اور اصلاحی نظریات یا ترقی پسندانہ خیالات کی تلخ گولیٹ کر پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ تمام کلاسیکی شعراء اس دائرہ سے باہر ہیں۔ کلاسیکی شعراء ہی پر کیا انحصار ہے اس "فارمولے" سے تو عہد حاضر کی جدید شاعری کا بڑا حصہ نکل جائے گا اور اس سے بیشتر کی نام نہاد رومانوی شاعری تو کسی شمار قطار ہی میں نہیں ہوگی۔!

"محبت کا غم" اور "محبت کے سوا غم" جیسی اصطلاحات سے نثار صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب میں دانشوری کے لئے "محبت" ایک اضافی شئے ہے اور انہی کی شاعری معیاری یا دانشوری کی حامل ہو سکتی ہے جو محبت کے علاوہ دیگر مسائل اور علوم کے ناشر ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میر، اصغر، فانی اور ذوق کی شاعری کی بابت نثار صاحب کا کیا نظریہ ہے میرا دعویٰ ہے کہ ان شعراء کے کلام میں جو شخص ماورائے محبت جمالیات زندگی کے ٹھوس حقائق انسانیت کا درد اور زمانے کے سوز و ساز تک پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ ان شاعروں کو بھا ہی نہیں۔ ان لوگوں کے یہاں محبت کے سوا ہزاروں غم مل جائیں گے لیکن اس کے لئے دیدۂ بینا چاہئے۔ میں آج کی نئی شاعری کو اس زمرے میں شامل نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ نئے شاعروں کے یہاں زندگی کے مسائل کی اتنی تفسیریں موجود ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

نثار صاحب کو اردو کے تمام شعری اور نثری سرمائے میں دانشوری کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پھر کر ان کی نظر سرسید جیسی دیوپیکر شخصیت سے نہیں ہٹتی۔ ساتھ میں حالی اور اقبال و غالب بھی پودنے کی طرح لگے ہوئے ہیں ظاہر ہے جب سرسید کو اپنا معیار بنا کر اردو ادب میں دانشوری کا جواز تلاش کیا جائے گا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔؟ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہمارا ادب بہت سے پہلو رکھتا ہی نہیں، اس میں غزل ہے، قصیدہ ہے، مرثیہ ہے، واسوخت ہے اور شہر آشوب ہے یا مطلع و مقطع ہے۔ نثر میں داستانیں ہیں، تقصے ہیں، ناول اور افسانے۔ انشاء اللہ خیر صلا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کو بھول جایئے تو ESSAY کا نمونہ بھی نہیں، جنس ہمیشہ ہمارے اعصاب پر سوار رہی ہے ۔۔۔ نثر میں بھی جب تک شاعرانہ استعاروں کی چاشنی اور مبالغہ یا کنایہ نہ ہو وہ ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی منطقی استدلال کو یا سائنٹیفک گفتگو کو بھلا ان سب باتوں سے کیا واسطہ ہے؟"

ادب و شعر اول اور آخر ادب و شعر ہے بعد کو فلسفہ، پیغام، علم یا نظریہ ۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ ادب پر بحث کرتے وقت آخر اسے دیگر علوم یا نظریات کی "اچھائیوں" اور "فلاح انسانیت و دارین" وغیرہ اصطلاحوں سے آمیز کر کے کیوں دیکھا جاتا ہے۔

نثار صاحب کو ہماری ادبی اصناف میں کچھ نہ ملا۔ غزل، قصیدہ، مطلع، مقطع سب بیکار۔ نثر، داستان، ناول، افسانہ محض فضول۔ نہ مضمون نہ مقالہ! ـــ معلوم نہیں ان کی یہ رائے پورے اردو ادب کے سرمائے سے متعلق ہے یا اس کے کسی مخصوص حصے سے ہے ـــ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ اردو شعر و ادب سے نالاں ہیں۔ یہ مایوسی یا تو مطالعے کی کمی کی غماز ہے یا اس بات کی مظہر ہے کہ اردو ادب کا مطالعہ سنجیدگی سے ڈوب کر نہیں کیا گیا ورنہ ہماری دیگر اصناف سے قطع نظر، قدیم اور متوسط عہد کے ادبی سرمائے میں صرف غزل جیسی معتوب صنف میں اتنا بیش بہا سامان ہے جس پر ہم شرم کے بجائے ناز کر سکتے ہیں۔ رہا افسانہ ناول اور داستانوں کا سوال تو ان میں بھی ہم نے آج تک کے بدلتے ہوئے تمام نظریات، انسانی محسوسات اور اقدار کو فن کے جمالیاتی پیرایوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر آزادی سے بعد تک ترقی پسندی کے زیر اثر جو ادب پیدا ہوا وہ بھی وزنی ہے۔ اور ادھر بیس سال کے اندر اردو شاعری میں جو نئی آوازیں اور نئے موضوعات و اسالیب نے جگہ پائی ہے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

مراسلات

گل رعنا سے نسخہ بھوپال ثانی تک

۲۲ فروری ۱۹۷۱ء کے "ہماری زبان" میں "میرا صفحہ" کے تحت جناب آل احمد سرور صاحب نے گل رعنا مرتبہ جناب مالک رام پر اظہار خیال کرتے ہوئے بعض گوشوں کی طرف غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے جن میں چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) "۔۔۔۔۔ لیکن ایک مسئلہ اور ہے جس کی طرف جناب مالک رام کی نظر کسی وجہ سے نہیں گئی، غالب نے خود کہا ہے کہ پچیس سال کی عمر تک ایک دفتر جمع ہو گیا تھا مگر نو دریافت دیوان غالب (نسخہ عرشی زادہ) اور نسخہ حمیدیہ[۱] کے کلام کو شاید دفتر نہ کہا جائے۔ پھر باقی کلام کیا ہوا؟"

(۲) "یہ بھی غور طلب بات ہے کہ غالب نے تیس سال کی عمر تک فارسی میں کم کہا اردو میں زیادہ مگر نہ صرف لوگ انھیں فارسی کا شاعر سمجھتے رہے وہ خود بھی اسی زلف کے اسیر رہے۔"

(۳) دوسری بات خاصی پر اسرار معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جس طرح نسخہ عرشی زادہ کے ترقیمے میں دن اور مہینہ موجود ہے اور سال غائب اسی طرح گل رعنا کے اس نسخے میں بھی دن اور مہینہ درج ہے اور سال غائب ہے۔ آخر دونوں نسخوں کے کاتب سال لکھنا کیوں بھول جاتے تھے۔"

(۴) "نسخہ عرشی زادہ کو بخط غالب کہا گیا ہے اگر اس نسخے سے گل رعنا کا انتخاب ہوتا تو شاید یہ تاویل ہو سکتی کہ چونکہ غالب نے سال نہیں لکھا تھا اس لئے اس کی نقل میں کاتب نے بھی نہ لکھا مگر یہ نسخہ تو غالب کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے اس میں سال کیوں درج نہیں؟"

(۵) مگر دو نسخوں میں سال کا نہ ہونا، اندیشہ ہائے دور دراز ضرور پیدا کرتا ہے۔"

یہ اندیشہ ہائے دور دراز ہی تھے جس نے ڈاکٹر انصار اللہ نظر کو عام رجحان سے ہٹ کر نسخہ بھوپال ثانی کے بخط غالب ہونے پر شک ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے نسخہ عرشی زادہ کے مطالعہ کے بعد اپنے "نتائج فکر" کو "ہماری زبان" میں "دیوان غالب نسخہ عرشی زادہ ایک جائزہ" کے عنوان سے پیش کیا اور اس کے بعد بھی اس سلسلے میں ان کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محقق کا کام حقائق کی تلاش ہے اور اس کی تلاش میں وہ اپنے وسائل اور رسائی کی حد تک پوری کوشش کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ صداقت کو پالے یا صرف ہوا میں ہاتھ پاؤں مارتا رہ جائے۔ اس طرح کی مثالیں ادب کی تاریخ میں بیشتر ملتی ہیں محققین کہیں تو صداقت کو پانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور کہیں گمراہی کا باعث بنے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان حضرات کا تعلق ہے جن سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کو برا نہیں کہا گیا اور نہ ان پر ذاتی حملے[۲] کئے گئے بلکہ ان کے کام کو بھی کسی حد تک سراہا گیا اور ان کی محنت اور تفحص و تلاش کے جذبے کی قدر کی گئی۔ ادب کے وسیع میدان کو تو چھوڑیئے خود غالبیات کے ماہرین سے وہ لغزشیں ہوئی ہیں کہ لوگ انگشت بدنداں ہیں۔

بھوپال والی غزل ؎

"بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو" کے متعلق کیا خیال ہے نسخہ بھوپال کے متعلق جو غلطیاں محققین نے کی ہیں کیا ان کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

مفتی انوار الحق مرتب نسخہ حمیدیہ تحریر کرتے ہیں:

"یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح اور ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود جابجا اصلاحیں کی ہیں۔"[۳]

ڈاکٹر عبداللطیف اس نسخہ کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"ان کا (مفتی انوار الحق) یہ کہنا کہ حاشیہ کے اضافہ اور اصلاحیں خود غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، راقم الحروف نے سرکار عالی کے محکمہ اسنادات تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی تنقیح کی اور غالب کے اصل خطوط سے مقابلہ کیا اور ان کی اصلاحوں اور اضافوں کے اصل خطوط

---

[۱] جناب سرور صاحب کا اشارہ نسخہ بھوپال سے ہے دراصل نسخہ حمیدیہ، نسخہ بھوپال + متداول کلام غالب۔

[۲] اور اگر کسی فرد پر ذاتی حملے کئے گئے تو وہ دنیائے تحقیق کے لئے بری مثال ہے۔ عبدالقوی دسنوی

[۳] نسخہ حمیدیہ صفحہ ۵

سے ذرا بھی مشابہ نہیں پایا گیا علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جا سکتیں۔[۱]

مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:۔

" دیوان کے متن اور حواشی دونوں میں جگہ جگہ اصلاحیں اور اضافے نظر آتے ہیں، ان کا قلم، روشنائی اور روش خط تینوں مختلف ہیں، جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے، دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی لکھی ہوئی غزلیں لکھی ہیں، مگر یہ سب ردیف یائی میں ہیں حک و اضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے سرخوشی یا کسی دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔[۲]

پروفیسر حمید احمد خاں کا خیال ہے:۔

"........ اسی بنا پر مفتی انوار الحق کا یہ قیاس محل نظر ہے کہ نسخہ دیوان "غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لئے لکھا گیا تھا" یہ امر بھی مشتبہ بلکہ بعید از قیاس ہے کہ دیوان کے حاشیہ کے اضافے اور متن کی اصلاحیں ۱۲۳۷ھ میں معرض تحریر میں آئیں یا دیوان کا یہ نسخہ بھوپال پہنچنے کے بعد مزید اندراجات کے لئے پھر کبھی دلی بھیجا گیا۔[۳]

مندرجہ بالا بیانات میں نسخہ بھوپال سے متعلق جو الگ الگ نتائج پیش کئے گئے ہیں ان کی بنا پر کسی دوسرے پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کی کوششوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ خود نسخہ بھوپال ثانی میں غیر مطبوعہ غزلوں کی تعداد مختلف حضرات نے اس طرح بتائی ہیں۔

نثار احمد فاروقی	۱۸	غیر مطبوعہ غزلیں	آج کل جون ۱۹۶۹ء
امتیاز علی عرشی	۲۰	"	" جولائی "
نثار احمد فاروقی	۲۰	"	" صحیفہ پٹنہ ستمبر اکتوبر "
"	۱۹	"	" نقوش غالب نمبر (حصہ دوم)
اکبر علی خاں	۲۵	"	" ہماری زبان اکتوبر ۱۹۶۹ء
ڈاکٹر گیان چند جین	۲۲	غزلیں	ہماری زبان ۸ نومبر ۱۹۶۹ء
عبدالقوی دسنوی	۲۵[۴]	"	مجلہ سیفیہ غالب نمبر
نثار احمد فاروقی	۲۵	"	تلاش غالب

غیر مطبوعہ غزلوں کے سلسلے میں جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ مندرجہ بالا بیانات سے واضح ہو جاتی ہیں اگرچہ بظاہر اس کے امکانات کم تھے کیونکہ غالب کی مطبوعہ غزلیں ہمارے سامنے تھیں لیکن اس بنا پر ہم کسی کی کوشش کو شبہ کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ تو پھر غالب کی تحریر کے سلسلے میں وہ بھی انیس (۱۹) سال کی عمر کی، اس طرح کا دعویٰ کر دینا۔

" بغیر کسی مبالغے کے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ غالب کی جتنی کثیر تعداد میں اصل تحریریں میں نے دیکھی اور استعمال کی ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کی نظر سے گزری ہوں یعنی ڈیڑھ ہزار سے بھی اوپر اردو، فارسی نظم و نثر کی تحریریں.....؛

اور اس لئے:

"اس لئے اگر غالب کے اس دیوان کے بارے میں میں یہ کہوں کہ یہ غالب کے اپنے قلم کا نقل ہوا ہے تو اس دعویٰ میں میرا تجربہ شاید ہی مجھے دھوکا دے:

میرے خیال میں تحقیق میں یہ روش درست نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ دعویٰ درست ہو تو بھی یہ انداز تحقیق کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا، قاری دعویٰ کو نہیں مانتا ثبوت چاہتا ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے اپنی تحریروں میں جو کچھ کہنے کی کوشش کی ہے اور اپنی بات سمجھانے کے لئے جس قسم کے ثبوت پیش کئے ہیں ان کی مدد سے آئندہ کس قسم کے نتائج نکلیں گے اس سلسلے میں کسی عجلت کے فیصلے کی ضرورت نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے تحقیق کرنے والوں کو ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا ہے اور کچھ لوگ اسی طرح سے سوچنے لگے ہیں، سرور صاحب کے یہ شکوک عجب نہیں اسی کا نتیجہ ہوں۔

اس لئے میں یہ بات کہوں گا کہ جب تحقیق کرنے والوں کو سچائی کی تلاش کا حق ہے تو اسے یہ حق بھی ملنا چاہئے کہ وہ اپنے نتائج فکر سے آگاہ بھی کرے۔ ان کے خلاف کسی قسم کے ذاتی حملے دنیائے تحقیق کے لئے کسی طرح درست نہیں۔

حال میں ہندوستان ٹائمز کے چند شماروں میں اپنی برتری کی جو زور آزمائی کی گئی ہے وہ اردو تحقیق کے لئے قابل فخر نہیں کہی جا سکتی چلتے چلتے ایک بات اور عرض کر دوں کہ بعض حلقوں سے یہ بات بہت پرزور طریقہ سے کہی جا رہی ہے کہ فلاں شخص نے سب سے پہلے نسخہ

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

---

[۱] نسخہ بھوپال اور ڈاکٹر عبداللطیف۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر ہماری زبان یکم مئی ۱۹۶۹ء۔

[۲] نسخہ عرشی ص ۶۰۔

[۳] دیوان غالب نسخہ حمیدیہ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں ص ۱۹۔

[۴] مجھے وہ غزلیں ایسی ملیں جو نسخہ حمیدیہ میں درج نہیں ہیں ورنہ غیر مطبوعہ غزلیں ۲۴ ہی ہیں۔ عبدالقوی دسنوی

اخبار و اذکار

مطالعۂ غالب کے لئے نئے امکانات پر مجلس مذاکرہ

آل انڈیا غالب سینٹنری کمیٹی کی طرف سے قائم کئے گئے غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب، نئی دہلی میں ایک مجلس مذاکرہ زیر صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں منعقد ہوئی جس میں اردو کے ممتاز اہل قلم اور غالب شناس موجود تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ غالب پر ابھی مزید ریسرچ اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ سوانحی پہلوؤں پر بلند معیار کا تحقیقی کام ہوا ہے مگر ابھی تک تنقید غالب کے نئے پہلو اور امکانات محتاج فکر و نظر ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ غالب کی شاعری کا معانی و بیان کی روشنی میں مطالعہ نہیں ہوا ہے ہمیں ہر دور کے تنقیدی معیاروں کو سامنے رکھ کر اس کی شاعری کے اہم پہلو دریافت کرنے چاہئیں۔

اس کے بعد جناب نثار احمد فاروقی نے اپنا مضمون "مطالعۂ غالب کے نئے امکانات" پیش کیا۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ ابھی تک انفرادی کوششوں سے غالبیات میں اضافے ہوئے ہیں اب وقت آیا ہے کہ نئے وسائل کی مدد سے اجتماعی حیثیت سے کام کئے جائیں۔ اس لئے غالب انسٹی ٹیوٹ جیسے عظیم ادارے میں تحقیقی کام صحیح خطوط پر ہونا چاہئے۔ نثار احمد فاروقی نے ایسے آٹھ بڑے منصوبے پیش کئے جنھیں غالب انسٹی ٹیوٹ میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ پہلا منصوبہ تصحیح متن کا ہے۔ اس کے تحت غالب کی کل تصانیف نظم و نثر (اردو و فارسی) کے مستند متنوں کے یونیفارم ایڈیشن تیار کرنے کا انھوں نے مشورہ دیا اور متنوں کی آٹھ جلدوں کا سرسری خاکہ بھی تجویز کیا۔

دوسرا منصوبہ غالب کے کلام کے تراجم سے متعلق تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ غالب کے کلام کو ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے علاوہ دنیا کی بڑی بڑی علمی زبانوں میں ترجمہ کرانے کے لئے کن ضروری امور کو سامنے رکھنا ہوگا۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ غالب کے افکار کا ایک ایسا نمائندہ انتخاب تیار کیا جائے جس میں آنے والی نسلوں کے لئے غور و فکر اور پسندیدگی کا سرمایہ ہو۔

تیسرا منصوبہ فرہنگ اور اشاریۂ غالب کا ہے۔ غالب کی مکمل لفظیات اور ان کا اشاریہ جدید اصول تدوین کی روشنی میں تیار کیا جائے اور چوتھی اسکیم کتابیات غالب (ببلوگرافی) اس میں غالب سے متعلق کل کتابوں اور مضامین کے مستند حوالے فراہم کئے جائیں، پانچواں منصوبہ غالب انسائیکلوپیڈیا کا ہے جس میں ان تمام اسمائے اعلام کی تفصیل مع حوالوں کے فراہم کی جائے جن کا ذکر غالب کی تحریروں میں آتا ہے

فاروقی صاحب نے چھٹی اسکیم میں غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کل تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں کیٹلاگ کی شکل میں چھاپنے کی تجویز پیش کی۔

ساتواں منصوبہ غالب کے تفصیلی مطالعے کا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ابھی تک متفرق اور مختصر سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ اب یہ ضروری ہے کہ ان سب جزوی تفصیلات کو یکجا کر کے غالب کی زندگی پر ایک مفصل کتاب لکھی جائے اس کی آٹھ جلدوں کا مجوزہ خاکہ انھوں نے تفصیل سے پیش کیا۔

فاروقی صاحب کی ان تجاویز کو عام طور سے پسند کیا گیا اور ان پر غور و فکر کی دعوت دی گئی۔ سب سے پہلے ماہر غالبیات جناب مالک رام نے فرمایا کہ "نثار صاحب کا مقالہ فکر انگیز ہے۔ مگر ہمارے ہاں استقلال سے کام نہیں ہوتا اس لئے اندیشہ ہے کہ یہ تجویزیں بھی تغافل کی نذر ہو جائیں گی۔ انھوں نے اس کی پرزور تائید کی کہ غالب کی تصانیف کے مستند متن سب سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہونے چاہئیں۔

انھوں نے فرمایا کہ تقسیم کار کے طریق پر عمل کیا جائے جو لوگ ترتیب متن کی صلاحیت رکھتے ہوں انھیں سہولتیں فراہم کی جائیں اور ایک کمیٹی نظر ثانی کے لئے بنا دی جائے جو ان میں تطبیق کر سکے۔ ان کے بعد جناب علی جواد زیدی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ نثار احمد فاروقی نے تحقیقی امور کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے لیکن اب ضروری یہ ہے کہ اردو ادب میں غالب کا صحیح مقام متعین کیا جائے اور عالمی ادب میں اس کی جگہ بنائی جائے۔ غالب پر تنقیدیں اکثر یک رخی اور انتہا پسندانہ ہیں متوازن تنقیدوں میں بھی غالب کا صحیح مقام، اس کے اسلوب اور آہنگ کی گہرائی اور وسعت کے اعتبار سے نہیں ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے فرمایا کہ نثار احمد فاروقی صاحب نے صرف تحقیقی کاموں کو اہمیت دی ہے اور زیدی صاحب نے تنقید کو۔ ہم نے تحقیق سے ابھی نتائج برآمد کرنے شروع نہیں کئے ہیں۔ صحیح متن مقصود بالذات نہیں ہوتا یہ ہمیں آگے لے جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تنقید و تحقیق کے درمیان کی دیواروں کو توڑنا اصلی کام ہوگا۔ ہمیں غالب کی شاعری اور خطوط کو ملا کر بھی پڑھنا ہے۔ ہم نے ابھی تک غالب کو ہندوستانی پس منظر میں پیش نہیں کیا ہے نہ اس کے ماحول کا مطالعہ کیا ہے۔ اپنے عہد کے تصورات سے غالب کا کیا رشتہ تھا اور ان کا پرتو اس کی شاعری میں کہاں تک ملتا ہے یہ جاننا بہت اہم ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے کہا "غالب کے مطالعے کے امکانات کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو ان کی زندگی کا مطالعہ پورے سماجی اور ادبی تحریکوں کے چوکھٹے میں کیا جائے جو ابھی تک نہیں ہوا۔ دوسرے ان کے محرکات شعری سے

بحث کی جائے۔

آخر میں مجلس مذاکرہ کے صدر ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرمایا کہ اس پر سب کو اتفاق ہے کہ تنقید و تحقیق دونوں ہی میں مزید مطالعے کی گنجائش ہے۔ نثار احمد صاحب کی تجویزیں اس سلسلے میں فکر انگیز ہیں اور یہ ادارہ اگر اس کام کو اسی طرح شروع کرے تو بالکل مناسب ہوگا۔ مگر کام کرنے والوں کی جماعت کا مل کر بیٹھنے کا رواج ہمارے ملک میں کم ہے موصوف نے فرمایا کہ تنقید اجتماعی طور پر نہیں ہو سکتی۔ یہ انفرادی ہی رہے گی اور ادارے بھی تحقیقی کام ہی کرتے ہیں تنقیدی نہیں۔ آخر میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب حسن نعیم نے مجلس مذاکرہ میں حصّہ لینے والوں کا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ شرکا میں ملک کے بہت سے ممتاز و نامور ادبا و صحافی موجود تھے۔ • نامہ نگار

پروفیسر عبدالقادر سروری کی وفات پر انجمن اردوئے معلیٰ کا جلسۂ تعزیت

۱۵ر مارچ ۷۱ء۔ شعبۂ اردو کے سیمنار میں انجمن اردوئے معلیٰ کی جانب سے ایک جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر عبدالقادر سروری کی اچانک وفات پر اظہار افسوس کیا گیا۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ سروری کے گرانقدر ادبی کارناموں سے واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے سروری صاحب کے اچانک انتقال کی خبر یقیناً بڑی اندوہناک ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سروری صاحب اپنی علمی صلاحیتوں اور خصوصیات سے قطع نظر ایک انتہائی منکسر المزاج اور مخلص شخص تھے جنھیں انسانیت بے حد عزیز تھی ان کا غم یقیناً ہمارا اپنا ذاتی غم ہے۔ اس کے بعد آپ نے درج ذیل قرارداد پڑھ کر سنائی۔

انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو علی گڑھ یونی ورسٹی کا یہ جلسہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری کا شمار اردو زبان و ادب کی نہایت معتدر اور قابل احترام شخصیتوں میں ہوتا تھا وہ ایک شفیق اور ہر دلعزیز استاد، ایک معتبر اور مستند ادیب اور اعلیٰ درجے کے محقق، ماہر لسانیات تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی علمی و تحقیقی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی۔ عرصہ دراز تک وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ رہ چکے تھے اور وہاں کے طلبہ و اساتذہ کی کئی نسلوں کو انھوں نے متاثر کیا تھا۔ تحقیق میں پروفیسر سروری کا مخصوص میدان دکنیات تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم دکنی ادب کی تحقیق و بازیافت کے سلسلے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے ساتھ سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر کام پروفیسر سروری نے انجام دیا ہے۔ پروفیسر سروری نے تحقیق کے علاوہ تنقید میں بھی قابل قدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ "جدید اردو شاعری" "اردو مثنوی کا ارتقا" "دنیائے افسانہ" اور "اردو کی ادبی تاریخ" ان کی ایسی تصانیف ہیں جنھیں اردو ادب کا طالب علم بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پروفیسر سروری کو لسانیات سے بھی خاص شغف تھا۔ ان کی تصنیف "زبان اور علم زبان" اپنے موضوع پر پہلی مستند کتاب ہے۔

عثمانیہ یونی ورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد سروری صاحب کشمیر یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے تھے۔ کشمیر کے دوران قیام میں بھی ان کے تصنیفی اور تحقیقی مشاغل جاری رہے۔ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" اور "کشمیر کے دو ادیب بھائی" ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ" بھی وہ مکمل کر چکے تھے اور یہ کتاب کلچرل اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔

پروفیسر سروری کے انتقال سے اردو زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہم مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اور ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہیں۔

• قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی سکریٹری انجمن اردوئے معلیٰ

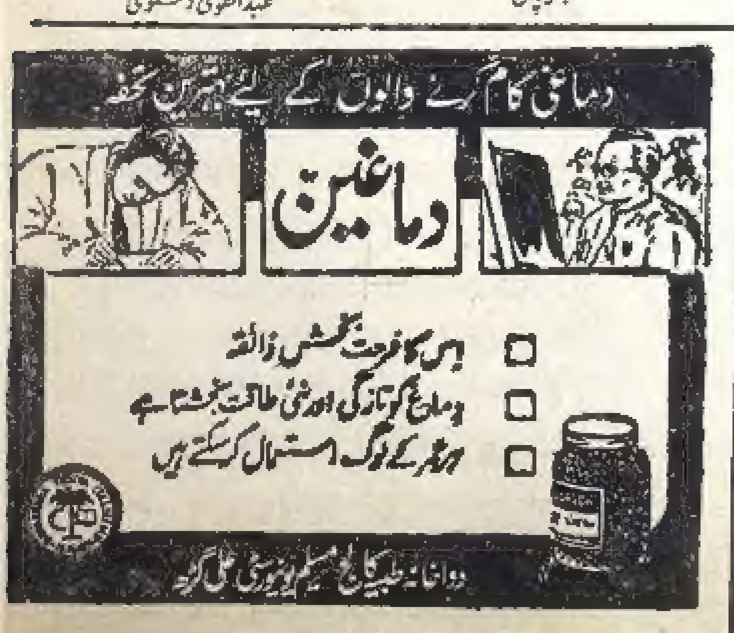
صفحہ ۸ سے آگے

بھوپال ثانی (ریاض غالب) کو بخط غالب کہا اس لئے اولیت کا سہرا اس کے سر ہے۔ مجھے اس سلسلے میں صرف اس قدر کہنا ہے کہ اس شخص کا نام کیوں نہیں لیا جا رہا ہے جس نے یہ کہتے ہوئے اسے توفیق صاحب کو دیا:

"میاں کیا یاد کروگے تمہیں مرزا غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان دے رہا ہوں۔"

(نقوش غالب نمبر دوم)

بھوپال — عبدالقوی دسنوی



بیان میں غلو کے عنصر سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ انیس زبان کے معاملے میں آج تک اپنی مثال آپ ہیں۔ انیس نے ہماری زبان کو جس جس طرح برتا، سنوارا، چمکایا اور اسے وسعت دی ہے اس کا اثر بعد کی پوری اردو شاعری پر پڑا ہے۔ انیس کا جادو کس پر نہیں چلا؟ چکبست کے مسدس تو انیس کا صد فی صد چربہ ہیں۔ رامائن میں رام چندر جی کی رخصت کا منظر پڑھیے تو ایسا معلوم ہوگا کہ علی اکبر اہل حرم سے رخصت ہو رہے ہیں، ماحول، زبان، لہجے، طرز بیان اور جذبات میں سر مو بھی فرق نہیں۔ اقبال کے مسدس انیس کے اثر سے چمک گئے ہیں، جوش ایسا زبان کا جادوگر ہر مصرعے میں انیس کا کلمہ گو نظر آتا ہے۔ ترقی پسند شعرا میں سردار، کیفی، نیاز حیدر، مخدوم، مجاز، وامق، راہی پر ہی موقوف نہیں رومانی شعرا تک کی نظموں پر انیس کی چھاپ ہے۔ کچھ نے انیس کا اثر براہ راست قبول کیا ہے اور بہت سوں نے جوش کے توسط سے انیس کا لہجہ اور زبان اپنائی ہے۔ آج بھی بیسویں صدی کے آٹھویں دہے میں مسدس کے فارم میں لکھتے ہوئے انیس سے بچنا ممکن نہیں۔ مسدس انیس سے اس طرح مخصوص ہو گیا ہے کہ اس فارم کی خامیاں اور خوبیاں دونوں انیس کا اثر مانی جانے لگی ہیں۔ اگر انیس مسدس کے بجائے کوئی اور ہیئت اپناتے تب بھی شاید یہی ہوتا۔ بیانیہ شاعری کے لیے مثنوی کا فارم زیادہ موزوں ہے مگر انیس نے مسدس کا رنگ کچھ اس طرح جمایا ہے کہ زور بیان مسدس ہی کا لازمہ سمجھا جانے لگا ہے۔ جدید دور میں آزاد نظم بیانیہ یا رزمیہ شاعری کے لیے زیادہ موزوں ثابت ہو سکتی ہے مگر انداز بیان میں انیس کی رزم و بزم آفرینی سے بچ کر لکھنا اس فارم میں بھی آسان نہیں۔

انیس کی شاعری کو یہ کہہ کر محدود کر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک مذہبی روایت ہی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا، اس سے آگے نہ گئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کربلا کا واقعہ ایک مردہ روایت نہیں، زندہ قوت اور علامت ہے، یہ واقعہ انیس اور ان کے دور کی ہم معاصر حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی تھا۔ اسی روایت سے ان کے مزاج کی تشکیل ہوئی تھی۔ آج بھی عزاداری کو روح مذہب ماننے والوں کے لیے کربلا تیرہ سو سال قبل کا ایک سانحہ نہیں بلکہ وہ تجربہ ہے جو ہر سال اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ خود ان پر گزرتا ہے اور جس کے ہر مرحلے میں وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔ انیس اور دوسرے مرثیہ گویوں نے کربلا کے واقعے کو ہندوستانی تاریخ و تہذیب کا ایک لازمی جز بنا دیا۔ کربلا کے کرداروں کو ہندوستانی تہذیب کے رنگ و آہنگ میں ڈھال کر انھیں ہماری تہذیب کی علامت بنا دیا۔ انیس کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک گذشتہ واقعے اور روایت کو زندگی بخش دی۔ جب کہ ان سے کمتر درجے کے شعرا ہم معاصر حقیقت کو بھی بے جان افسانہ بنا دیتے ہیں۔

مرثیہ ہندوستان کی مسلم معاشرت اور مشترکہ تہذیب کا ترجمان ہے۔ غزل کو ہماری تہذیب میں جو مقبولیت کا درجہ حاصل ہے وہ مرثیے کو نہیں۔ مگر وہ تہذیب جو غزل کی پروردگار رہی اور وہ شعائر تہذیب جو غزل سے وابستہ تھے، اب سکڑتے اور محدود ہوتے جا رہے ہیں، مرثیہ جن شعائر سے وابستہ ہے وہ آج بھی جوں کے توں زندہ ہیں۔ عزاداری کی ہندوستانی رسمیں نہ ایران سے آئی ہیں، نہ عرب سے یہ خالص ہندوستانی ہیں اور مرثیہ اس تہذیب غم سے اسی طرح منسلک ہے جیسے غزل ہماری تہذیب عاشقی سے جڑی ہوئی ہے۔ انیس صدی کے سلسلے میں مرثیے کی تہذیبی اہمیت پر بھی نئے زاویۂ نگاہ سے کام کیا جا سکتا ہے۔ اس روشنی میں انیس اردو زبان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب کے بھی ایک اہم نمائندے بن جاتے ہیں۔

ابھی اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ انیس کے پورے مراثی کا ایسا انتخاب کیا جائے جس میں ہر مرثیہ اپنی جگہ وحدت ہونے کے ساتھ مرثیے کی موجودہ شکل کے مقابلے میں زیادہ منضبط، مستحکم اور مربوط دکھائی دے۔ اس قسم کے انتخاب کے لیے انیس کے تمام مراثی کا مصرع بہ مصرع ہی نہیں بلکہ لفظ بہ لفظ مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اگر اس انتخاب کو ایک سیر حاصل مقدمے، کرداروں کے جامع تعارف اور واقعہ کربلا اور عزاداری کی رسوم کی تھوڑی سی تشریح کے ساتھ شائع کیا جائے تو انیس فہمی میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انیس کے مشہور مراثی کے علاوہ نسبتاً کم معروف مرثیوں کو بھی غور سے پڑھنا ہوگا۔ کیونکہ ان میں بھی کئی شاہکار دبے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک مرثیہ

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے — کو شاہکار سمجھ لینا ویسا ہی ہوگا جیسے ہم میر کے بہتر نشتروں کی روایت کو آنکھ بند کر کے ان کے کلیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیے بغیر میر کی پوری شاعری کا ثمرہ مان لیں۔

اور سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ کوئی صاحب نظر انیس کے اچھے انتخاب کا انگریزی ترجمہ کر کے اسے تفصیلی مقدمے کے ساتھ شائع کرائے تاکہ انیس کی اہمیت و عظمت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جا سکے۔

مردم شماری اور اردو والوں کا فرض

۱۰ مارچ سے مردم شماری کا کام شروع ہو گیا ہے اور ۲۸ مارچ تک جاری رہے گا۔ اس موقع پر مردم شماری کے خانہ نمبر ۱۲ میں اپنی مادری زبان اردو لکھوائیے اور دیکھ کر اطمینان کر لیجیے کہ شمار کنندہ نے صحیح اندراج کیا ہے یا نہیں

وحید اختر

میرا صفحہ

اس سال انیسؔ کی وفات کو سنہ ہجری کے حساب سے پورے سو سال ہو جائیں گے۔ اس طرح سے سال رواں اردو والوں کے لئے انیسؔ صدی کا سال ہے۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات پوری دنیا میں منعقد ہوئیں۔ ایک دہلی ہی میں دو شاندار عمارتیں یادگار کی صورت میں کھڑی ہو گئیں۔ غالب اکیڈمی اور ایوان غالب۔ غالب پر تحقیق و تنقید کے کام کا سیلاب سا آ گیا۔ غالب اس کے مستحق بھی تھے۔ ہم نے کم از کم اپنے ایک شاعر کی اس کے شایان شان یاد فرمائی۔ غالب کو ان تقریبات ہی نے دنیا میں متعارف کرایا ورنہ چند برس پہلے تک غالب عالمی سطح پر اتنے جانے نہ جاتے تھے۔ جب ایک صاحب ذوق نے امریکہ میں غالب کے نام پر ایک خطیر رقم وقف کی تو وہاں کے اخباروں میں جو خبر چھپی تھی، اس میں غالب کو ہندوستان کا "ایک کم معروف شاعر" کہا گیا تھا۔ لیکن آج غالب کا نام بیرونی دنیا کے لئے اجنبی یا غیر معروف نہیں رہا۔ اردو کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب ہم اپنے اساتذہ اور کلاسیکی سرمایے کو اچھے ترجموں اور اعلیٰ تنقیدی کارناموں کے ذریعے مغرب و مشرق میں روشناس کرائیں۔ ہمارا شعری سرمایہ اتنا مالدار ہے کہ اگر دنیا اس سے واقف ہو سکے تو ہماری زبان کا وقار عالمی سطح پر بڑھ سکتا ہے۔ دنیا کی بعض قدیم زبانیں آج تک محض اپنے ادبی شاہکاروں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ادب و شعر کا ذوق رکھنے والے سنسکرت یونانی اور لاطینی اس لئے سیکھتے اور پڑھتے ہیں کہ ان زبانوں کا کلاسیکی ادب پڑھ سکیں۔ ہم اپنے کلاسیکی شاعروں کو دنیا سے متعارف کرا کے اپنی زبان کا ذوق بھی عام کر سکتے ہیں۔

انیسؔ اردو کے ایسے ہی شاعروں میں سے ہیں، جن سے ہماری زبان کی آبرو قائم ہے۔ تین چار برس قبل حیدرآباد کی انیس اکیڈمی نے مجھے انیسؔ پر ایک مضمون پڑھنے کے لئے مدعو کیا۔ اس جلسے میں صدر نے انیسؔ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ "انیس ہمارے ایسے شاعر ہیں، جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔" یہ اردو والوں کی سادہ لوحی اور معصومیت ہے کہ وہ اپنے ہر پسندیدہ شاعر کو بین الاقوامی سطح پر فرضی شہرت دے کر مطمئن ہو لیتے ہیں۔ انیسؔ کو تو ابھی خود اردو میں اس طرح متعارف نہیں کرایا گیا، جو ان کا حق ہے۔ انیسؔ کے مراثی کا کوئی مستند اور مکمل ایڈیشن اب تک موجود نہیں ہے۔ نظم طباطبائی کی ترتیب دی ہوئی مراثی انیسؔ کی تین جلدیں ہی موجودہ ایڈیشنوں میں آج بھی غنیمت سمجھی جا سکتی ہیں۔ نولکشور کے ایڈیشن کا چلن عام ہے۔ پاکستان سے بھی انیسؔ کے مراثی کا ایک ایڈیشن چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ مگر ان میں بھی کوئی ایڈیشن ایسا نہیں جس کو جامع اور ہر طرح سے قابل اعتبار مانا جائے۔ طباطبائی ایڈیشن میں بھی تنقید کی ایسی مثالیں ہیں، جنھیں محض نقل کرنے والوں کی غلطیوں ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح غالب کے دیوان کے متعدد مستند ایڈیشن موجود ہیں اس طرح کا ایک ایڈیشن بھی انیسؔ کا موجود نہیں۔ انیسؔ کے جو مرثیے مروجہ ایڈیشنوں میں ملتے ہیں وہ تعداد کے لحاظ سے بھی کسی طرح مکمل نہیں مانے جا سکتے۔ مسعود حسین رضوی صاحب کے پاس انیسؔ کے متعلق بڑا ذخیرہ ہونا چاہئے ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح عرشی نے دیوان غالب کا مکمل اور مستند ایڈیشن فرہنگ حواشی اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کیا ہے، انیسؔ کا مکمل کلام بھی کئی جلدوں میں ایڈٹ کیا جائے۔ اس کام کے لئے نظر پروفیسر مسعود حسین رضوی ہی کی طرف اٹھتی ہے۔ مسعود صاحب نے انیسؔ پر کافی کام کیا ہے، شاہکار انیسؔ، رزم نامۂ انیسؔ اور روح انیسؔ کے ذریعے انھوں نے انیسؔ کی ادبی قدر و قیمت کے پہچنوانے میں بڑی خدمت کی ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعارف انیسؔ کا حق ابھی پورا نہیں ہوا۔

انیسؔ پر ایک بھی ایسی تنقیدی کتاب نہیں جو انیسؔ کی ادبی حیثیت اور ان کے فن کا عرفان عام کرنے میں مدد دے۔ کچھ لوگ انیسؔ کو ایک خاص فرقے کے ساتھ منسوب اور محدود کر دیتے ہیں حالانکہ انیسؔ کی عظمت کا اعتراف ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ اگر ہم اپنے عظیم شعرا کی فہرست بنائیں تو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ انیسؔ کا نام لینا ناگزیر ہوگا۔ انیسؔ کو عزاداری کے لوازم میں محدود کرنا نہ تو مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی۔ ایک فرقے نے انیسؔ کو مذہبی تقدس دے کر عقیدت کے منبر پر بجا دیا ہے تو ادبی حلقوں نے انیسؔ کی طرف سے چشم پوشی ہی کو اپنی روشن خیالی اور غیر مذہبیت کی علامت سمجھ لیا ہے۔ میرے نزدیک ہر بڑی شاعری تقدس کا درجہ رکھتی ہے، مگر یہ تقدس ہم سے مرتبہ شناسی کا مطالبہ کرتا ہے کورانہ عقیدت یا تنگ نظر تعصب کا نہیں۔

اگر ہم اردو نظم کے ارتقا کا جائزہ لیں تو انیسؔ کے غیر معمولی اثر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میرے ایک خفی المشرب بزرگ فرماتے تھے کہ "انیسؔ کی شاعری اردو کا قرآن ہے۔ اردو پر ایمان لانا ہے تو انیسؔ کو پڑھو" یہ ہماری زبان کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس

(باقی صفحہ ایک پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 927 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2256/57